علم سمجھنے (یَفۡقَهُونَ) کا مرہون منت ہے

اشیاء کے وجود (ہیئت) اور اسماء کا یاداشت میں محفوظ ہونا ان کے تقابلی جائزے کا مرہون منت ہے اس طرح واضح ہے کہ مختلف اشیاء علامات، اطلاعات، آیات کی انفرادیت اور ان کے مابین باہمی ربط، تعلق (relationship)، فرق کو سمجھنا اور اس تعلق اور فرق سے پیدا ہونے والے نتیجے کو جاننا عقل سے کام لینا ہے اور یاداشت میں محفوظ بھی اسی بناء پر ہوتا ہے۔ عقل اور اشیاء کے تقابلی جائزے کا مفہوم انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنا، جانچنا ہے۔

يُقَلِّبُ ٱللَّهُ ٱلَّيۡلَ وَٱلنَّهَارَۚ ''اللہ رات اور دن کو الٹتا پلٹتا ہے (بدلتے رہتا، alternate)

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّأُوْلِي ٱلۡأَبۡصَٰرِ ۝ بیشک اس میں بصارت والوں کیلئے ایک سبق ہے'' (سورۃ النور۔۴۴)

يُقَلِّبُ کا مادہ 'ق ل ب' ہے اور اس کے بنیادی معنی الٹنا پلٹنا، لوٹ پوٹ کرنا، کسی چیز کو بدلتے رہنا ہیں۔ انسان کا دل بھی کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ لحہ بہ لحہ بدلتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی قلب کہتے ہیں اور چونکہ عقل وبصیرت کا کام بھی یہ ہے کہ اشیاء اور ان کے خواص کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے اس لئے قلب بھی عقل کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

أَفَلَمۡ يَسِيرُواْ فِي ٱلۡأَرۡضِ فَتَكُونَ لَهُمۡ ''تو کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ ان کیلئے ہوجاتے

قُلُوبٞ يَعۡقِلُونَ بِهَآ أَوۡ ءَاذَانٞ يَسۡمَعُونَ بِهَاۖ

قلوب ایسے جن سے وہ عقل کا کام لے سکتے، یا کان ایسے جن کے ساتھ وہ سن سکتے؟

فَإِنَّهَا لَا تَعۡمَى ٱلۡأَبۡصَٰرُ وَلَٰكِن تَعۡمَى ٱلۡقُلُوبُ ٱلَّتِي فِي ٱلصُّدُورِ ۝

''اس لئے بصارتیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں'' (الحج۔۴۶)

علم یاداشت میں محفوظ اسی صورت میں ہوتا ہے اگر عقل، قلب اسے چھان پھٹک (Process) کر کے دیکھ لے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یاداشت میں سے نکال کر بیان کرنے کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ کمپیوٹر کی یاداشت (Memory) میں بھی وہی بات محفوظ رہتی ہے جسے اس نے (Process) یعنی چھان پھٹک لیا ہو۔

وَمِنۡهُم مَّن يَسۡتَمِعُ إِلَيۡكَۖ

''ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو (بظاہر) کان لگا کر آپ (ﷺ) کو سنتے ہیں

''لِحَـدِيثٍ'' ۔عربی حرف ''لِ'' یہ معنی پیدا کرتا ہے ''فائدہ حاصل کرنے کیلئے ،سبب ظاہر کرنے کیلئے (تا کہ)،نفی کی تا کید کیلئے''۔

''حَدِيثٍ'' واحد ہے جمع احادیث۔ آقائے نامدار ﷺ کی جانب سے دعوت طعام پر بلائے گئے اہل ایمان مہمانوں سے کہا گیا کہ وہ طعام نوش کرنے کے بعد آقائے نامدار ﷺ سے کسی حدیث کو لینے کی خاطر وہاں بیٹھے نہ رہیں بلکہ فوراً منتشر ہو جائیں۔

آقائے نامدار ﷺ کے گھروں پر دعوت طعام کیلئے بلائے جانے والے اہل ایمان میں سے مہمان کون لوگ تھے؟ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں فیصلہ سنا دیا ہوا ہے کہ اُن کے بعد اُن جیسا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ بات اپنی عقیدت کے زیر اثر نہیں کہی اگرچہ آقائے نامدار ﷺ کے جاں نثاروں کے پاؤں کی دھول بننا میرے لئے باعث صد افتخار ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ

''تم میں سے کوئی ایک بھی ان کے برابر،ان جیسا نہیں ہوسکتا جس نے فتح سے پہلے مال خرچ کیا اور جنگ کی۔ اُن کا درجہ و مقام ان سے بہت بڑا ہے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی۔ اور اللہ نے سب سے اچھا وعدہ کیا ہے'' (حوالہ الحدید۔۱۰)

''مِنكُمْ'' ''مِن'' حرف جر۔ ''كُمْ'' ضمیر جمع مذکر مخاطب مجرور معنی ''تم (قرآنِ مجید سننے اور پڑھنے والے) لوگوں میں سے''۔

''مِنكُمْ'' میں روز قیامت تک ہر وہ انسان شامل ہے جس تک قرآنِ مجید پہنچا۔ فیصلہ کرنا ہمارا اپنا کام ہے کہ اس آیت مبارکہ کے نزول کے بعد ان صحابہ کرام جیسا دنیا کا کوئی انسان نہیں ہوسکتا تو ان سے بڑھ کر کسی درجے اور مقام پر اسے فائز کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ عقل جس کا بنیادی کام فرق کا تعین کرنا ہے اگر استعمال کی جائے اور تفکر کیا جائے تو تخیل سے بنائے گئے بڑے بڑے ''برج'' یکلخت زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی موجودگی میں آقائے نامدار ﷺ کے جان نثاروں کے درجے اور مقام تک کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا تو پھر اگر کوئی شخص قرآنِ مجید کو تسلیم کرنے کا دعویٰ بھی کرے اور دوسرے سانس میں براہ راست یا لفظوں کے ہیر پھیر سے نبوت کا دعویٰ بھی کرے تو آپ اس شخص کو کیا کاذب کے علاوہ کچھ اور مان سکتے ہیں؟

آقائے نامدار ﷺ کے گھر پر بلائے گئے مہمانوں سے کہا گیا، جن میں سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر بن خطاب، سیدنا عثمان، سیدنا علی ابن ابی طالب جیسی ایسی عظیم ہستیاں بھی شامل ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اپنا اعلان ہے ''ان سے اللہ راضی ہوا اور اللہ سے وہ راضی ہوئے'' (حوالہ التوبہ۔۱۰۰) کہ وہ طعام نوش کرنے کے بعد آقائے نامدار ﷺ کے گھر پر حدیث کی خاطر بیٹھے نہ رہیں بلکہ منتشر ہو جائیں۔ آقائے نامدار ﷺ سے براہ راست حدیث لینے کی خاطر ان کے گھر رکنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ وجہ؟

إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ ''یہ بات نبی کو دکھ دیتی ہے''۔ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ ''اور تمہارے لئے روا نہیں کہ (یہ روش اختیار کر کے) اللہ کے رسول کو دکھ دو'' (حوالہ الاحزاب۔۵۳)۔ یہاں کچھ دیر رک کر ہمیں غور و فکر کر لینا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسولِ کریم کو دکھ دینے والوں کو تو ایسی حیات نہیں ملے گی جس کی خواہش کبھی ماند نہ پڑے۔ بلکہ فیصلہ یہ ہے

ہوتا ہے جس سے باتیں سننے اور سنانے کی خواہش ہے۔ اور اس خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا بہترین وقت اس وقت میسر آتا ہے جب وہ شخص کھانے پر مدعو کر لے جس سے کوئی بات، حدیث سننے یا اسے سنانے کی آرزو ہو۔ آقائے نامدار ﷺ اور قرآنِ مجید پر ایمان لے آنے والوں کو دوٹوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی تھی

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَدۡخُلُواْ بُيُوتَ ٱلنَّبِيِّ إِلَّآ أَن يُؤۡذَنَ لَكُمۡ إِلَىٰ

طَعَامٍ غَيۡرَ نَـٰظِرِينَ إِنَىٰهُ وَلَـٰكِنۡ إِذَا دُعِيتُمۡ فَٱدۡخُلُواْ

''اے ایمان لانے والو! نبی کے گھروں میں داخل مت ہو سوائے اس وقت جب تمہیں دعوت طعام دی جائے، لیکن اس وقت نہیں کہ تم کھانا پکنے کا انتظار کرو بلکہ اس وقت (کھانا تیار ہو جانے پر) جب تمہیں بلایا جائے تو اس وقت گھروں میں داخل ہو۔

فَإِذَا طَعِمۡتُمۡ فَٱنتَشِرُواْ وَلَا مُسۡتَـٔۡنِسِينَ لِحَدِيثٍۚ إِنَّ ذَٰلِكُمۡ كَانَ يُؤۡذِي ٱلنَّبِيَّ

فَيَسۡتَحۡيِۦ مِنكُمۡۖ وَٱللَّهُ لَا يَسۡتَحۡيِۦ مِنَ ٱلۡحَقِّۚ

پھر جب تم کھا پی چکو تو اپنے گھروں کی راہ لو اور حدیث معلوم کرنے کیلئے وہاں بیٹھے نہ رہو۔ یہ بات نبی کو دکھ دیتی ہے

اور وہ تم سے (چلے جانے کا کہتے ہوئے) شرماتا ہے، مگر اللہ حق (بات کہنے) سے نہیں شرماتا'' (حوالہ الاحزاب۔۵۳)

وَمَا كَانَ لَكُمۡ أَن تُؤۡذُواْ رَسُولَ ٱللَّهِ

''اور تمہارے لئے روا نہیں کہ (یہ روش اختیار کر کے) اللہ کے رسول کو دکھ دو'' (حوالہ الاحزاب۔۵۳)

''نَـٰظِرِينَ'' اسم فاعل جمع مذکر مجرور نکرہ، انتظار کرنے والے، اور ان کے ''غَيۡرَ'' وہ لوگ ہوتے ہیں جو وقت سے پہلے آ کر انتظار کرنے والے نہیں ہوتے۔ وقت پر آنے والے شخص کو انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ إِنَىٰهُ کا مادہ ''ا ن ی'' ہے جس کے معنی کسی بات کا وقت ہو جانا۔ تکمیل کو پہنچ جانا۔ آقائے نامدار ﷺ کے گھر پر دعوت طعام کیلئے بلائے جانے والے اہل ایمان کو منع کیا گیا کہ وقت طعام سے قبل نہ آئیں کہ کھانا پکنے کے انتظار میں کچھ وقت وہاں گزار لیں بلکہ اُس مقررہ وقت پر داخل ہوں جس وقت آنے کی انہیں دعوت دی گئی ہے۔

''انتَشِرُواْ'' امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ''تم مدعوین الگ الگ ہو جاؤ، منتشر ہو جاؤ، اپنے اپنے گھروں، کاموں پر چلے جاؤ''۔ اہل ایمان سے کہا گیا کہ آقائے نامدار ﷺ کے گھروں میں دی گئی دعوت پر طعام نوش کرنے کے بعد اُن کے گھر سے چلے جائیں۔ طعام نوش کر لینے کے بعد مہمان میزبان کے گھر پر کیوں ٹھہرے رہتے ہیں؟ جن لوگوں کو میزبان سے کوئی بات، حدیث پوچھنے کی خواہش ہوتی ہے وہ طعام نوش کر لینے کے بعد وہیں رکے رہتے ہیں۔ آپ ﷺ سے محبت کرنے والوں اور دعوت پر بلائے گئے معزز مہمانوں کو آپ ﷺ کے گھر سے منتشر ہونے کی نصیحت کیوں دی؟ وَلَا مُسۡتَـٔۡنِسِينَ لِحَدِيثٍ ''اور کسی حدیث کیلئے وہاں بیٹھے نہ رہو''۔

''مُسۡتَـٔۡنِسِينَ'' اسم فاعل جمع مذکر منصوب، دلچسپی کے ساتھ بیٹھ رہنے والے۔ کس مقصد کیلئے لوگ دلچسپی سے بیٹھ رہنے والے بنتے تھے؟

قرآنِ مجید نے اپنا تعارف یوں بتایا ہے کہ کتاب لاریب ہے (ایسی کتاب جس میں بیان کردہ حقائق شک وشبہ سے بالا تر ہوں)۔ کتاب لاریب کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ زمان ومکان کے حوالے کی قید سے آزاد ہوتی ہے اور زمان ومکان کے حوالے کی قید سے آزاد کتاب حقیقت بیان کرتی ہے اور حقیقت اختلاف اور تضاد کے امکان سے آزاد ہوتی ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلۡقُرۡءَانَۚ وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِندِ غَيۡرِ ٱللَّهِ لَوَجَدُواْ فِيهِ ٱخۡتِلَٰفٗا كَثِيرٗا ﴿٨٢﴾

''تو کیا وہ قرآن (مجید) میں تدبر نہیں کرتے! اور اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا

تو اس میں بیان کردہ باتوں میں کثیر اختلاف پاتے'' (سورۃ النساء۔۸۲)۔

کتابِ لاریب کی حقیقت اور مفہوم کو ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ زمان ومکان کے خالق اللہ تعالیٰ کے سوا قرآن مجید اگر ز.ان ومکان کی کسی ہستی کی تصنیف ہوتا تو اس میں آگے پیچھے بیان کردہ باتوں میں بکثرت اختلاف اور تضاد بیانی پائی جاتی۔ اور یہ اصول اور حقیقت واضح کر دی کہ اختلاف اور تضاد بیانی سے ایسی کتابیں (بشمول کتب تفاسیر) پاک نہیں اور نہ آئندہ وجود میں آنے والی کتابیں ہو سکتی ہیں جو زمان ومکان میں محدود ہستی کی تحریر پر مبنی ہوں۔ اور یوں یہ حقیقت بھی عیاں ہو گئی کہ ان کتابوں میں اختلاف اور تضاد کے امکانات زیادہ ہوں گے جس کا مصنف اس میں موجود تحریر اور کلام کو کسی دوسری شخصیت سے منسوب کرے۔

اگر معاذ اللہ قرآنِ مجید کے اپنے بیان کو پس پشت ڈالتے ہوئے تفقہ فی الدین کے حکم کے معنی اور مفہوم وہی لیں جو بعض مفسرین ہمیں بتاتے رہے ہیں تو ایک گھمبیر نوعیت کا تناقض (تضاد)، اختلاف سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تمام اہل ایمان کیلئے ممکن نہیں کہ اپنے گھروں اور شہروں سے باہر تفقہ فی الدین کیلئے نکل سکیں اس لئے اس مقصد کیلئے مختلف افراد مل کر ایک طائفہ، گروہ کی صورت باہر نکلیں۔ اگر تفقہ فی الدین کے معنی اور مفہوم یہ ہوں کہ دین اسلام اور اس کے اوامر ونواہی کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کیلئے اپنے گھروں سے باہر جانے کیلئے کہا گیا ہے تو پھر آپ اس سے تو اتفاق کریں گے کہ اس مقصد کیلئے آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کے گھروں سے بہتر کائنات میں کوئی مقام نہیں۔ اور مکۃ المکرّمہ اور مدینہ منورہ کے اہل ایمان کیلئے اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین موقعہ اس وقت ہو سکتا تھا جب آقائے نامدار ﷺ اُن لوگوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت پر بلاتے تھے۔

آقائے نامدار ﷺ نے لوگوں کی اس خواہش اور مطالبے کو کسی قسم کی بھی لگی لپٹے رکھے بغیر رد کر دیا کہ قرآنِ مجید کے علاوہ آپ ﷺ اپنی جانب سے کوئی بات، حدیث، قول انہیں سنائیں اور بتائیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو قرآنِ مجید کا انکار کرتے تھے۔ اور آقائے نامدار ﷺ اور قرآنِ مجید پر ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ کے رسولِ کریم سے قرآنِ مجید کے علاوہ حدیثیں سننے کا کیا شوق تھا؟ ادھر اُدھر کی باتیں سننے اور سنانے کی جسے خواہش ہو اس کیلئے نہ صرف خود اس کے پاس فالتو وقت ہونا چاہئے بلکہ اس کیلئے بھی فالتو وقت درکار

وَلَهُۥٓ أَسۡلَمَ مَن فِى ٱلسَّمَـٰوَٲتِ وَٱلۡأَرۡضِ طَوۡعًا وَكَرۡهًا

''اور اسی کے تمام مطیع و فرمانبردار ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں رغبت اور بے رغبتی سے'' (آلِ عمران۔۸۳)

طَوۡعًا کا مادہ ''ط و ع'' ہے اور بات رحکم کو ماننے کو کہتے ہیں جو بطیّب خاطر، دل کی پسندیدگی سے مانی جائے۔

كَرۡهًا کا مادہ ''ک ر ہ'' ہے اور اس کے معنی مشقت، ناپسندیدگی، جبر و اکراہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور تمام کی تمام کائنات أَسۡلَمَ ہے اور جو کوئی أَسۡلَمَ ہے اس کا ٱلدِّينُ ہے ٱلۡإِسۡلَـٰمُ اور فرمایا

إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلۡإِسۡلَـٰمُ‌ۗ

''اللہ کے نزدیک (مادے اور حیات کیلئے) دین تو صرف اسلام ہے'' (حوالہ آلِ عمران۔۱۹)

کائنات کی ہر شئے فرمانبردار ہے، خوشی سے اور بے رغبتی سے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ یہ اس کی تقدیر ہے۔ فرمانبرداری کائنات کے تسلسل اور وجود کی ضامن ہے۔ کائنات کی ہر شئے کی مقدار ہے۔ پیمانہ ہے۔ زوج ہے، ایک دوسرے کیلئے معاون و مددگار اور تکمیل کا سبب کہ ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔ اور تمام اشیاء کی آپس میں موزوں نسبت، تقدیر ہے۔ ایک دوسرے سے مربوط و منظّم ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے جدا اور منفرد لیکن معمولی دھیان سے بھی دیکھیں تو سب ایک اکائی نظر آئیں گے۔ یہ ان کی تقدیر ہے۔ یہ ان کی فطرت ہے۔ یہ ان کے ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُ پر ہونے کا مظاہرہ ہے۔ یہ ان کے أَسۡلَمَ ہونے پر دلیل ہے۔ اسلام میں تفرقہ نہیں۔ وہ دِينِ ٱللَّهِ پر ہیں۔ کائنات ٱلۡإِسۡلَـٰمُ کی پیروکار ہے۔ سبحان اللہ! اور یہ تخلیق کس کے لئے ہے؟

هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعًا

''وہی تو ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں ہے تمام تمہارے لئے تخلیق کیا'' (حوالہ البقرۃ۔۲۹)

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَـٰوَٲتِ وَمَا فِى ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعًا مِّنۡهُ‌ۚ (حوالہ الجاثیۃ۔۱۳)

''اور اس نے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین پر ہے اپنی طرف سے سب تمہارے لئے پابند (مسخر) کر دیا ہے''

قرآنِ مجید کے نزول کے وقت کائنات کے اس ''الدین'' کے متعلق علم میں عرب کے اردگرد کی دنیا عربوں سے آگے تھی اور آج تو امت مسلمہ سے بہت آگے ہے۔ لیکن آج ہم سے یورپ اور امریکہ کی درس گاہوں میں تفقہ فی الدین کائنات کے متعلق علم کو سمجھنے کیلئے جانے والوں کی اکثریت لوٹ کر واپس نہیں آتی کہ اپنی قوم کو خبردار کریں اور وہ ان قوموں کی تیاریوں، علم سے چوکنا ہوں۔ یورپ اور امریکہ ہمارے ذہن بھی ہم سے چھین رہے ہیں کہ ہم علم اور ذہن کے قدردان نہیں رہے۔ علم جس قوم کی میراث تھی وہ اپنے اور پرائے لوگوں کے تخیل کی باتوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کیا ہم مادہ مکڑی کی طرح جانتے بوجھتے ہوئے خالی کاغذ کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں؟

وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

''لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے'' (سورۃ الروم۔۳۰)

آیت مبارکہ میں ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ سے قبل کہی گئی باتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کہ ان میں ثبات، دوام اور عدم تبدیلی کا اظہار ہے۔ اور سورۃ التوبہ کی ۳۶ اور سورۃ یوسف کی آیت ۴۰ میں ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ کے متعلق فرمان کو اس کے ساتھ ملا کر ایک نظر دیکھیں تو ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ اور فطرت کے معنی و مفہوم بیک وقت واضح ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کا یہ اظہار کہ وہ اِلٰہ ہے اس تعلق سے ہوا کہ وہ فَاطِرِ، خالق ہے۔ فَطَرَ (مادہ ''ف ط ر'') کے معنی پھاڑنا، شق کرنا لیکن پہلی مرتبہ کی خصوصیت اس کے بنیادی معنوں میں شامل ہے۔ اس لئے فَطَرَ کے معنی کسی چیز کو پہلی مرتبہ کرنا ہیں۔

قرآنِ مجید میں یہ لفظ پہلی بار سورۃ الانعام کی آیت ۱۴ میں رسولِ کریم ﷺ سے کہلوایا گیا

قُلْ أَغَيْرَ ٱللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ

(آپ ﷺ ان سے) کہیں ''اللہ کو جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست (ولی) بنالوں''۔

اور دوسری بار یہ لفظ الانعام کی آیت ۷۹ میں آیا ہے اور آقائے نامدار ﷺ کے جدِ امجد ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوا تھا

إِنِّى وَجَّهْتُ وَجْهِىَ

''میں نے اپنا چہرہ، رخ کیا ہوا ہے

لِلَّذِى فَطَرَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ

اس کی جانب جو آسمانوں اور زمین کا عدم سے تخلیق کرنے والا ہے، حَنِيفًا،

فطرت کے عام طور پر لئے جانے والے معنی اور مفہوم سے ایک غلط فہمی پر مبنی تاثر یہ ہے کہ ہر شئے کی طرح اللہ رب العزت اور انسان کی بھی انہی معنی اور مفہوم میں ایک فطرت ہے۔ فَطَرَ کے بنیادی معنی عدم سے تخلیق کرنا ہیں اور یہ تخلیقی فعل شئے کو وجود دینے کے ساتھ اظہار ہے ہستی کے وجود کا۔ ذات، ہستی اور تخلیق کردہ شئے میں بنیادی فرق ارادے کا ہے۔ اور ارادے کو وجود دینے کا نام تخلیق ہے اور نتیجہ، اظہار ہے وہ شئے۔ ارادہ مقصد لئے ہوتا ہے اس لئے جو شئے تخلیق ہوگی وہ اس مقصد کی تکمیل کا سامان اپنے اندر سموئے ہوئے ہو گی۔ اور مقصد کی تکمیل کا جو سامان اس شئے میں پنہاں ہے وہ اس کی فطرت ہے۔ فَاطِرِ، خالق شئے کی تخلیق کے مقصد کے حوالے سے اس کی فطرت مرتب کرتا ہے۔ یہ فِطْرَتَ ٱللَّهِ ہے۔ یہ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ ہے۔ یہ دِينِ ٱللَّهِ ہے۔ پوچھا گیا أَفَغَيْرَ دِينِ ٱللَّهِ يَبْغُونَ ''مگر کیا وہ اللہ کے دین کے سوا ڈھونڈتے ہیں؟'' دِينِ ٱللَّهِ کیا ہے؟

يَوْمَ خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ مِنْهَآ أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ

اس یوم سے جب اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا، ان میں سے چار حرمت کے ہیں"

تخلیق کی ابتدا سے جس شئے، بات، حقیقت، اصول، نظام، فطرت شئے کو ثبات اور دوام ہے اس کو قرار دیا

ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ "یہ ہے ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ" (حوالہ سورۃ التوبہ۔۳۶)

ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ کی اصطلاح دو الفاظ پر مشتمل ہے۔ دوسرے لفظ ٱلْقَيِّمُ کا مادہ "ق و م" ہے اور اس کے معنی کھڑا ہونا، اعتدال اور توازن پر ہونا، ثابت اور دائم رہنا ہیں۔ اشیاء کے مابین تعلق (relationship) کے تعین کا نام علم ہے۔ اور اس اظہارِ شئے کو ہم اس کی فطرت کہتے ہیں۔ اور شئے کے تعلق (relationship) کی وسعت کا جس قدر اظہار ہوتا جائے گا اس کی حقیقت اتنا ہی واضح اور حیطہ ادراک میں آتی جائے گی۔ یہ مادہ کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ لیکن ذات، ہستی، ذی حیات کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اپنے وجود کا اظہار وہ خود کرے۔ کیا ہستی اپنا احساس، ادراک تعلق، رشتے کے اظہار یعنی فطرت کے بغیر کرا سکتی ہے؟ جواب نفی میں ہے۔ سورۃ الروم میں فرمایا" فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا"۔ اس قدر ثبات اور دوام کے ساتھ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ (اللہ الٰہ ہے) پر اپنے آپ کو قائم رکھنے پر اصرار کیوں ہے؟ اس لئے کہ ہستی اللہ ہے۔ اور اس ہستی کا اظہار، تعلق، نسبت، فطرت یہ ہے کہ تمہارا الٰہ ہے۔ اگر فطرتِ شئے جانے بغیر مادے کی حقیقت کو نہیں پا سکتے تو بنیادی اور اہم ترین تعلق (فطرت) سے انکار کر کے اللہ تعالیٰ کو کیسے جان سکو گے؟ یہ اصرار اس لئے ہے

فِطْرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِى فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيْهَا

"یہ اللہ کی ہستی کا اظہار ہے جس پر اس نے انسان کو عدم سے تخلیق کیا"۔

خالق اللہ ہے اور انسان اس کی تخلیق۔ دونوں کے مابین تعلق (relationship) فَطَرَ عدم سے تخلیق کا ہے۔ فَاطِرِ اور مخلوق کا تعلق ہے۔ اور یوں اللہ نے اپنی ذات کا اظہار انسان کے ساتھ اس تعلق سے کیا کہ وہ ان کا الٰہ ہے۔

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ ٱللَّهِ

"اللہ کی عدم سے تخلیق حیات (فطر الناس) کیلئے کوئی متبادل نہیں"

ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ

"یہ ہے ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ"۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ

''آپ (ﷺ) پوچھیں ''کیا وہ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں؟''

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ○

'' مگر نصیحت تو صرف أُولُو الْأَلْبَابِ (دانا و بینا، مقصدِ شئے پر نگاہ رکھنے والے) لیتے ہیں'' (حوالہ الزمر۔۳۹)۔

اور آقائے نامدار ﷺ سے یہ بات بھی منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ علم حاصل کرنے کیلئے اگر چین جانا پڑے تو جاؤ۔ اب ظاہر ہے کہ چین میں انسان کیلئے متعین دین اسلام کا علم تو نہیں ملنا تھا۔ قرآنِ مجید کے نزول کے زمانے میں چین میں پرنٹنگ پریس ایجاد ہو گئی تھی قرآنِ مجید نے ہر قوم کے طریقے کو جس کی وہ پیروی کرتے ہیں دین کہا ہے۔ یہود و نصاریٰ، مشرکین جو کچھ کرتے ہیں اسے ان کا دین کہا گیا ہے۔ کافروں سے کہا گیا لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ﴿٦﴾ 'تمہارا دین تمہارے لئے ہے اور میرا دین میرے لئے'

(الکافرون۔۶)۔

یہ بات تو واضح ہے کہ تفقه فی الدین کے حکم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنے شہروں اور ملک سے دوسرے شہروں اور ممالک میں جا کر دین اسلام کو سمجھا جائے تو پھر کس ''دین'' کو سمجھنے کیلئے مسلمانوں کے مختلف قبیلوں کے افراد ایک طائفہ بنا کر اپنے شہر سے نکلنے کیلئے کہا گیا؟ الدِّينُ کا مادہ ''د ی ن'' ہے اور اس کے معنی غلبہ، اقتدار، حکومت، آئین، قانون، نظم و نسق، نظام، معاشرت، اطاعت و فرمانبرداری، روش، ضابطہ حیات، جزا و سزا ہیں۔ ہمیں بظاہر دکھائی دیتا ہے کہ الدِّينُ کے معنی مختلف ہیں لیکن ان تمام معانی پر غور کریں تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ تمام آپس میں منسلک ہیں، ان کے درمیان تعلق اور نسبت ہے۔ انسان کا تمام علم اشیاء کے باہمی ربط، تعلق، رشتے کا مرہون منت ہے۔ ہم اشیاء کے باہمی تعلق، رشتے (relationship) سے ''حقیقتِ شئے'' کا ایک حد تک یعنی جزوی طور پر ادراک کرتے ہیں کہ یہ رشتہ ان اشیاء کی صفات کو ہم پر عیاں کرتا ہے۔ یہ ہر انسان کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور اس کے احساس اور تصور (perception) میں نمایاں بھی ہے چاہے اسے بیان کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

کیا جس کائنات میں ہم بستے ہیں اس کا دین کوئی نہیں؟ قرآنِ مجید نے اس کائنات کے وقت کی ابتدا کے متعلق جس میں انسان بستا ہے

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ

''یقیناً مہینوں کی گنتی اللہ کی جانب سے، اللہ کی کتاب میں، بارہ مہینے ہے

قرآنِ مجید اپنے نزول کے زمانے سے لے کر آخر زمان کے لوگوں کیلئے نصیحت اور حکم ہے۔ کیا نزول کے زمانے میں مکۃ المکرّمہ اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے علاوہ دوسرے شہروں میں مدارس ومراکزِ علم تھے جہاں جا کر لوگوں نے اوامر ونواہی کا علم حاصل کرنا تھا؟ کیا یہ حکم مکۃ المکرّمہ اور مدینہ منورہ کے مومنین کیلئے نہیں تھا؟ انہوں نے اپنے ان شہروں سے نکل کر کون سے علاقوں کے مدارس ومراکزِ علم میں جا کر دین اسلام کے احکام اور اوامر اور نواہی کو سیکھنا تھا کہ واپس آ کر ان محترم ترین شہروں میں بسنے والی اپنی قوم کو خبردار کرنا تھا؟

ان دو سوالوں ہی سے کیا یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ مفسرین کے اس دوسرے گروہ کی رائے میں بھی کوئی وزن اور دلیل نہیں؟

اہل ایمان کے ایک طائفہ کو اپنے شہروں سے نکل کر اس مقصد کیلئے ترغیب دی گئی لِّيَتَفَقَّهُوا۟ فِى ٱلدِّينِ ”تاکہ الدین“ میں تفقہ کریں وَلِيُنذِرُوا۟ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوٓا۟ إِلَيْهِمْ اور تاکہ اپنی قوم کو خبردار (مطلع) کریں جب وہ اپنی قوم میں واپس لوٹیں“۔ تفقہ فی الدین کرنے کے بعد قوم کو خبردار کرنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اسلام اور اس کے اوامر ونواہی سے ڈرانا اور انہیں غفلت سے بیدار کرنا مقصد ہے؟ قوم کو خبردار کرنے کا مقصد بھی تفقہ فی الدین کے معنی کو مزید نکھار کے واضح کردے گا

لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ٥

”تاکہ قوم محتاط (taking precautions) ہو جائے، اور محتاط رہے“ (التوبہ۔۱۲۲)

”يَحْذَرُونَ“ (جمع مذکر غائب۔ هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔ قوم) اس کا مادہ ”ح ذ ر“ ہے اور اس کے معنی خوف زدہ کرنے والی چیز سے بچنا اور محتاط رہنا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بچاؤ اور چوکنا رہنے کے ہیں۔ قرآنِ مجید کی آیات کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ يَفْقَهُونَ کی منزل بصارتوں اور سماعتوں کی مرہونِ منت ہے اور اس کے معنی علم کو قلب وذہن میں محفوظ کرنا اور سمجھنا ہے۔ قرآنِ مجید کی آیات میں دین اسلام کو بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے دین اسلام کو سمجھنے کیلئے مومنین کو اپنے شہروں سے باہر جا کر تفقہ فی الدین کرنے کی حاجت اور ضرورت تھی اور نہ آج ہے۔ ارشاد فرمایا

ٱنظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ ٱلْءَايَـٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ٥

”دیکھ! ہم کس طرح پھیر پھیر کر آیتوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں“ (حوالہ الانعام۔۶۵)

قَدْ فَصَّلْنَا ٱلْءَايَـٰتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ٥

”ہم نے اپنی آیات کو الگ الگ کر کے بیان کر دیا ہے تاکہ لوگوں کو سمجھ آئے“ (حوالہ الانعام۔۹۸)

قرآنِ مجید کے نزول کے زمانے کے عرب سیدھے سادے صحرانشین تھے۔ اور ان کے اردگرد کی دنیا کے لوگ کائنات کے متعلق دوسرے علوم میں آگے تھے۔ آقائے نامدار ﷺ کا فرمان ہے کہ ہر مومن مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَالُواْ ذَرۡنَا نَكُن مَّعَ ٱلۡقَـٰعِدِينَ ٥

اور کہتے ہیں ''ہمیں چھوڑ دیں، بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہنے دیں'' (التوبہ۔۸۶)

رَضُواْ بِأَن يَكُونُواْ مَعَ ٱلۡخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُونَ ﴿٨٧﴾ (التوبہ۔۸۷)

'وہ اس پر خوش ہیں کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ (تفقہ) سمجھتے نہیں' جہاد سے استثناء مانگنے اور پیچھے رہ جانے والوں کے پاس تو (يَفۡقَهُونَ) سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں وہ کسی دوسرے کو کیا دین سمجھائیں گے اور خبردار کریں گے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ پیچھے رہ جانے والا کوئی ان مجاہدین کو ڈرائے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جہاد سے واپس لوٹے ہیں۔ منافقین ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے متعین کئے ہوئے جائز عذر کی بناء پر پیچھے رہ جانے والا طائفہ اور مجاہدین کے مابین فرق اور فاصلے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے

لَّا يَسۡتَوِي ٱلۡقَـٰعِدُونَ مِنَ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ غَيۡرُ أُوْلِي ٱلضَّرَرِ وَٱلۡمُجَـٰهِدُونَ

''مومنین میں سے کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہنے والوں اور مجاہدین دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے''۔ فرق بتایا

فَضَّلَ ٱللَّهُ ٱلۡمُجَـٰهِدِينَ بِأَمۡوَٰلِهِمۡ وَأَنفُسِهِمۡ عَلَى ٱلۡقَـٰعِدِينَ دَرَجَةً

''اللہ تعالیٰ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کا درجہ گھر بیٹھ رہنے والوں سے بلند رکھا ہے'' (حوالہ النساء۔۹۵)

اللہ رب العزت کے نزدیک اعلیٰ درجے کے مالک مال اور جان سے جہاد کرنے والے مجاہدین کو پیچھے رہ جانے والا طائفہ دین کے کس حکم سے ڈرائے گا؟ مفسرین کے اس گروہ کی خیال آرائی کے بے وزن ہونے کا ثبوت اس سے بھی دیکھ لیا جائے کہ خبردار کسے کرنا ہے اور کب کرنا ہے؟ قَوۡمَهُمۡ ''ان کی قوم، اپنی قوم'' کو خبردار کرنا ہے۔ واپس آنے والا مجاہدین کا طائفہ، دستہ ''قوم'' نہیں کہلاتا۔ اور انہوں نے اپنی قوم کو خبردار اس وقت کرنا ہے جب تفقہ فی الدین کرنے کے بعد قوم میں واپس لوٹیں۔

مفسرین کے دوسرے گروہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کے نزدیک لِّيَتَفَقَّهُواْ فِي ٱلدِّينِ میں ''علم دین سیکھنے کی اہمیت کا بیان، اس کی ترغیب اور طریقے کی وضاحت ہے اور وہ یہ کہ ہر بڑی جماعت یا قبیلے میں سے کچھ لوگ دین کا علم حاصل کرنے کیلئے اپنا گھر بار چھوڑیں اور مدارس و مراکز علم میں جا کر اسے حاصل کریں اور پھر آ کر اپنی قوم میں وعظ و نصیحت کریں۔ دین میں تفقہ حاصل کرنے کا مطلب اوامر اور نواہی کا علم حاصل کرنا ہے''۔

فَلَوۡلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ

''اس لئے ایسا کیوں نہ کرلیا جائے کہ ہر جماعت میں سے کچھ افراد ایک طائفہ (گروپ، گروہ) بن کر نکلیں''

افراد کا گروہ کس لئے نکلے؟

لِّيَتَفَقَّهُواْ فِى ٱلدِّينِ

''تا کہ ''الدین'' میں تفقہ کریں

وَلِيُنذِرُواْ قَوۡمَهُمۡ إِذَا رَجَعُوٓاْ إِلَيۡهِمۡ

اور تا کہ اپنی قوم کو خبردار (مطلع) کریں جب وہ اپنی قوم میں واپس لوٹیں''

مفسرین کے جس گروہ نے آیت مبارکہ کو جہاد کے حوالے سے بتایا ہے ان کے نزدیک '' لِيَتَفَقَّهُواْ کا مخاطب پیچھے رہ جانے والا طائفہ ہے۔یعنی ایک گروہ جہاد پر چلا جائے وَ تَبۡقَىٰ طَآئِفَة (یہ محذوف ہوگا) اور ایک گروہ پیچھے رہے جو دین کا علم حاصل کرے اور جب مجاہدین واپس آئیں تو انہیں بھی احکام دین سے آگاہ کر کے انہیں ڈرائیں''۔آیت مبارکہ کے الفاظ اور بیان پر نگاہ رکھیں تو ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ ان مفسرین نے قرآنِ مجید کی بات کو اُس کے اپنے الفاظ سے بیان نہیں کیا بلکہ اپنے تخیل سے خیال در خیال آرائی کی ہے۔اور جن الفاظ وَ تَبۡقَىٰ طَآئِفَة کو اپنے تخیل سے انہوں نے محذوف قرار دیا انہیں آیت مبارکہ میں کہیں رکھ اور لگا کر دیکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ یہ کہیں سے بھی محذوف تصور نہیں کئے جاسکتے۔

ان مفسرین نے تخیل سے یہ بات تو کہہ دی کہ پیچھے رہ جانے والا گروہ دین کا علم حاصل کرے اور اللہ کی راہ میں قتل ہونے سے بچ رہنے والے مجاہدین کو دین کے احکام سے آگاہ کریں اور ان زندہ بچ جانے والے مجاہدین کو ڈرائیں لیکن یہ نہیں دیکھا کہ جہاد سے پیچھے رہنے کے طلبگار اور شائقین تو منافقین کہلاتے ہیں۔جہاد کیلئے منافقین اپنے گھروں اور بیویوں سے الگ ہونا نہیں چاہتے۔

لَا يَسۡتَـٔۡذِنُكَ ٱلَّذِينَ يُؤۡمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأَخِرِ أَن يُجَـٰهِدُواْ بِأَمۡوَٰلِهِمۡ وَأَنفُسِهِمۡ

''اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر جو لوگ ایمان رکھتے ہیں

وہ آپ (ﷺ) سے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد نہ کرنے کی چھوٹ (استثناء) نہیں مانگتے'' (حوالہ التوبہ۔۴۴)

وَإِذَآ أُنزِلَتۡ سُورَةٌ أَنۡ ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَجَـٰهِدُواْ مَعَ رَسُولِهِ ٱسۡتَـٔۡذَنَكَ أُوْلُواْ ٱلطَّوۡلِ مِنۡهُمۡ

اور جب سورۃ نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر اعتماد کرو اور رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو ان میں صاحب ثروت بھی تجھ سے اجازت مانگتے ہیں

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱثَّاقَلْتُمْ إِلَى ٱلْأَرْضِ ۚ

''اے ایمان لانے والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کیلئے) نکلو
تو تم زمین کے ساتھ چپک جاتے ہو؟'' (حوالہ التوبہ۔۳۸)

إِلَّا تَنفِرُوا۟ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ''اگر تم نہیں نکلو گے تو وہ تمہیں دردناک سزا دے گا'' (حوالہ التوبہ۔۳۹)

ٱنفِرُوا۟ خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَٰهِدُوا۟ بِأَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ

''نکلو ملکے پھلکے اور بھاری (اسلحے کا) بوجھ اٹھائے ہوئے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو'' (حوالہ التوبہ۔۴۱)

لَا يَسْتَـْٔذِنُكَ ٱلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ أَن يُجَٰهِدُوا۟ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۗ

''اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر جو لوگ ایمان رکھتے ہیں
وہ آپ (ﷺ) سے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد نہ کرنے کی چھوٹ (استثناء) نہیں مانگتے'' (حوالہ التوبہ۔۴۴)

لَٰكِنِ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ جَٰهَدُوا۟ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ

''لیکن رسول (کریم ﷺ) اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے ہیں'' (حوالہ التوبہ۔۸۸)

جہاد سے استثناء پانے والوں کے متعلق بتایا

لَّيْسَ عَلَى ٱلضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى ٱلْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ

''کمزور، ضعیف لوگوں پر گناہ نہیں، اور نہ بیماروں پر ہے اور نہ ان پر ہے جو خرچ کرنے کیلئے اپنے پاس کچھ نہیں پاتے'' (حوالہ التوبہ۔۹۱)

وَلَا عَلَى ٱلَّذِينَ إِذَا مَآ أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ أَجِدُ مَآ أَحْمِلُكُمْ

''اور نہ ان پر الزام ہے جو آپ (ﷺ) کے پاس آئے کہ انہیں سواری مہیا کریں
تو آپ (ﷺ) نے کہا ''میرے پاس کوئی سواری نہیں جس پر میں تمہیں سوار کرلوں'' (حوالہ التوبہ۔۹۲)

جہاد کے متعلق ان آیات مبارکہ کو پڑھنے کے بعد ہر کسی کے پاس فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے کہ جان سکے کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۲۲ میں اس فرمان کا تعلق جہاد سے ہے یا نہیں وَمَا كَانَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا۟ كَآفَّةً ۚ ''اور مومنین کیلئے ہرگز ممکن نہیں کہ تمام کے تمام نکل سکیں''۔

تمام مومنین کا نکلنا ممکن نہیں تو کیا کیا جائے؟

ہونے کی کوشش کرتے۔ آیت میں انہیں حکم دیا گیا کہ ہر جہاد اس نوعیت کا نہیں ہوتا کہ جس میں ہر شخص کی شرکت ضروری ہو (جیسا کہ تبوک میں ضروری تھا) بلکہ ایک گروہ ہی کی شرکت کافی ہے۔ ان کے نزدیک لِيَتَفَقَّهُوا کا مخاطب پیچھے رہ جانے والا طائفہ ہے۔ یعنی ایک گروہ گروہ جہاد پر چلا جائے وَ تَبْقَىٰ طَائِفَةٌ (یہ محذوف ہوگا) اور ایک گروہ پیچھے رہے جو دین کا علم حاصل کرے اور جب مجاہدین واپس آئیں تو انہیں بھی احکام دین سے آگاہ کر کے انہیں ڈرائیں۔ دوسری تفسیر اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق جہاد سے نہیں ہے بلکہ اس میں علم دین سیکھنے کی اہمیت کا بیان، اس کی ترغیب اور طریقے کی وضاحت ہے اور وہ یہ کہ ہر بڑی جماعت یا قبیلے میں سے کچھ لوگ دین کا علم حاصل کرنے کیلئے اپنا گھر بار چھوڑیں اور مدارس و مراکز علم میں جا کر اسے حاصل کریں اور پھر آ کر اپنی قوم میں وعظ و نصیحت کریں۔ دین میں تفقہ حاصل کرنے کا مطلب اوامر و نواہی کا علم حاصل کرنا ہے تا کہ اوامر الٰہی کو بجا لا سکے اور نواہی سے دامن کشاں رہے اور اپنی قوم کے اندر بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے]

آیت مبارکہ کے اس حکم لِّيَتَفَقَّهُوا۟ فِى ٱلدِّينِ وَلِيُنذِرُوا۟ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوٓا۟ إِلَيْهِمْ کے متعلق مطالعہ اور تفقہ فی الدین کے معنی اور مفہوم کو سمجھنے کیلئے ایک مترجم اور مفسر کا حوالہ کافی ہے کیونکہ اکثر تفسیروں میں الفاظ کے معمولی رد و بدل سے یہی مواد ملے گا جو در حقیقت قدیم تفاسیر القرطبی، الجلالین اور ابن کثیر میں بیان کردہ باتوں ہی کا محض ترجمہ و مفہوم ہے۔ ''تفسیر'' کے جن دو طرح کے انداز کا حوالہ دیا گیا ہے ان دونوں کو معمولی دھیان سے ایک دو بار پڑھیں تو ان میں تضاد اور جھول، سقم واضح دکھائی دے گا اور بات بے وزن اور سطحی محسوس ہوگی۔

وَمَا كَانَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا۟ كَآفَّةً ''اور مومنین کیلئے ہر گز ممکن نہیں کہ تمام کے تمام نکل سکیں''۔ ان معنی کیلئے مثالیں:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ''اور کسی نفس کیلئے ممکن نہیں کہ مر جائے سوائے اللہ تعالٰی کے اذن کے''

(حوالہ آل عمران۔۱۴۵) وَمَا كَانَ لِنَبِىٍّ أَن يَغُلَّ ''اور یہ ہر گز ممکن نہیں کہ کوئی نبی خیانت کرے'' (حوالہ آل عمران۔۱۶۱)

وَمَا كَانَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا۟ كَآفَّةً ''اور مومنین کیلئے ہر گز ممکن نہیں کہ تمام کے تمام نکل سکیں''۔ مفسرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ جہاد سے متعلق ہے۔ قرآنِ مجید سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات جہاد کی خاطر نکلنے سے متعلق ہے؟

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ خُذُوا۟ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُوا۟ ثُبَاتٍ أَوِ ٱنفِرُوا۟ جَمِيعًا ﴿٧١﴾ (النساء۔۷۱)

''اے ایمان لانے والو! مقابلہ کے لئے مستعد اور چوکنے رہو۔ پھر جیسا موقع ہو الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا تمام کے تمام اکٹھے ہو کر''

اس انداز کا سننا محض کھیل ہے۔ 'مُعْرِضِیْنَ' (اسم فاعل جمع مذکر۔اعراض مصدر باب افعال) جس کے معنی منہ موڑنے والے، رخ
پھیرنے والے، اجتناب کرنے والے۔اس کا مادہ ''ع ر ض'' ہے جس کے معنی کسی چیز کا ظاہر ہو جانا، یا کسی شیئ کو کسی کے سامنے پیش
کرنا۔اس کا تعلق سماعت سے نہیں بصارتوں سے ہے۔ یہ لوگ قرآنِ مجید کی کسی حدیث کو نہ سنجیدگی سے سنتے ہیں اور جب تحریری قرآنِ
مجید میں نئی بات، حدیث ان کے سامنے آتی ہے تو اس سے اعراض، گریز کرتے ہیں۔قرآنِ مجید کے بیان سے غیر مبہم انداز میں واضح ہے
کہ فقہ کے معنی محسوسات کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کر کے ان کے ذریعے مجرد (Abstract Truths) کا سمجھنا نہیں ہیں۔ قرآنِ
مجید خبر ہے۔الحق یعنی ثابت شدہ بات، حدیث ہے۔قرآنِ مجید ''احسن تفسیر'' ہے یعنی حقیقتوں کے متعلق بہترین اور آسان فہم انداز میں
بریکنگ نیوز (Breaking news) ہے۔ خبر اپنے آپ میں حقائق (facts) کا بیان ہے اس لئے اس سے نتائج اخذ کر کے ان
کے ذریعے مجرد (Abstract Truths) کا سمجھنا نہیں کہلاتا بلکہ نصیحت اور عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔

جناب راغب بھی مادہ ''ف ق ہ'' کے معنی بیان کرتے ہوئے شاید اہل علم کی تجویز کردہ اس اصطلاح سے متاثر ہو گئے جس کا
مطلب یہ تھا کہ قرآنِ مجید کے اصولوں کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق (اور روزمرہ حالات کے مطابق) جزئی ''قوانین''
مستنبط کئے جائیں اور پھر فقہ کے معنی کسی خاص امام کا مسلک قرار پا گئے۔ جیسے فقہ حنفی کے معنی امام ابو حنیفہ کا مسلک یا ان فقہاء کے فتاوی جو
امام ابو حنیفہ کے مسلک کے پیرو تھے۔اور یہ معنی اور مفہوم بھی سورۃ التوبہ کی آیت مبارکہ ۱۲۲ میں تفقہ فی الدین سے لیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا۟ كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا۟
فِى ٱلدِّينِ وَلِيُنذِرُوا۟ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوٓا۟ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾

''اور مومنین کیلئے ہرگز ممکن نہیں کہ تمام کے تمام نکل سکیں۔اس لئے ایسا کیوں نہ کر لیا جائے کہ ہر جماعت میں سے کچھ افراد ایک
طائفہ (گروپ، گروہ) بن کر نکلیں ''تا کہ ''الدین'' میں تفقہ کریں اور تا کہ اپنی قوم کو خبردار (مطلع) کریں جب وہ اپنی قوم میں واپس
لوٹیں۔اس طرح امکان ہے کہ قوم محتاط (taking precautions) ہو جائے، اور محتاط رہے''

اس آیت مبارکہ کا مروجہ ترجمہ اور تفسیر کچھ یوں ہے:

[ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی۔تفسیر مولانا صلاح الدین یوسف۔قرآنِ کریم شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس۔سعودی عرب]

[ترجمہ ''اور مسلمانوں کو یہ نہیں چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک
چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور تا کہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب وہ اس کے پاس آئیں، ڈرائیں تا کہ وہ
ڈر جائیں''۔ تفسیر ''بعض مفسرین کے نزدیک اس کا تعلق بھی جہاد سے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ پچھلی آیات میں جب پیچھے رہنے والوں
کیلئے سخت وعید اور زجر و توبیخ بیان کی گئی تو صحابہ کرامؓ بڑے محتاط ہو گئے اور جب بھی جہاد کا مرحلہ آتا تو سب کے سب اس میں شریک

قَوۡمًا لَّا یَكَادُونَ یَفۡقَهُونَ قَوۡلًا (حوالہ الکہف۔۹۳)

(یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اس نے ان سے ادھر) ''ایک قوم کو پایا جو بات (قول) کم ہی سمجھتے تھے''

قول، کسی دوسرے کی زبان کے الفاظ کو سمجھنے کا یہ مفہوم نہیں بنتا کہ علم حاضر سے علم غائب تک نہیں پہنچ سکتے تھے

قُلۡ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّاۚ لَّوۡ كَانُواْ یَفۡقَهُونَ ٥

''آپ (ﷺ) کہہ دیں ''دوزخ کی آگ بہت ہی سخت گرم ہوگی ۔ کاش وہ سمجھتے'' (حوالہ التوبہ۔۸۱)

یہ بات منافقین کی جہاد سے بچنے کیلئے کہی ہوئی اس بات کا جواب ہے ''گرمی میں مت نکلو''۔

فَمَالِ هَٰٓؤُلَآءِ ٱلۡقَوۡمِ لَا یَكَادُونَ یَفۡقَهُونَ حَدِیثًا ٥

''آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی حدیث (ایک بات) بھی انہیں سمجھ نہیں آتی'' (حوالہ النساء۔۷۸)

''حَدِیثًا'' کسی تجریدی شئے کو نہیں کہتے۔ قول الفاظ پر مشتمل ایک مکمل بات کو کہتے ہیں۔ قول کسی بات کو الفاظ کے روپ میں زبان سے ادائیگی یا تحریر کے ذریعے دوسرے کی سماعتوں اور بصارتوں کے ذریعے اس کے ذہن وقلب میں منتقل کرنے کیلئے ہے۔ اور قول کے ذریعے جو بات ایک قلب وذہن سے دوسرے قلوب واذہان میں منتقل کی جارہی ہوا سے عربی زبان میں ''حدیث'' کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم کو قولِ رسول کریم ﷺ کہا گیا اور قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ''حدیث'' قرار دیا گیا۔ قولِ رسول میں بتائی گئی بات، حدیث اللہ تعالیٰ کی ہے، رسولِ کریم کی نہیں۔ مُحدَث، ٱلۡحَدِیثِ کا مادہ ''ح د ث'' ہے۔ ٱلۡحَدِیثِ قدیم کی ضد ہے ابن فارس کے مطابق اس کے معنی عدم سے وجود میں آنے کے ہیں۔ نئی بات، حوادث سامنے آنے والے نئے نئے واقعات کو کہتے ہیں۔

مَا یَأۡتِیهِم مِّن ذِكۡرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحۡدَثٍ إِلَّا ٱسۡتَمَعُوهُ وَهُمۡ یَلۡعَبُونَ ﴿٢﴾ لَاهِیَةً قُلُوبُهُمۡۗ

''ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ''ذکر'' (قرآنِ مجید) میں جو بھی نئی بات سامنے آتی ہے، اسے کھیل سمجھ کر وہ سنتے ہیں۔

اور ان کے دل کسی اور خیال میں ہوتے ہیں'' (حوالہ الانبیاء۔۲۔۳)

وَمَا یَأۡتِیهِم مِّن ذِكۡرٍ مِّنَ ٱلرَّحۡمَٰنِ مُحۡدَثٍ إِلَّا كَانُواْ عَنۡهُ مُعۡرِضِینَ ﴿٥﴾

'ان کے پاس رحمٰن کی طرف سے ''ذکر'' (قرآنِ مجید) میں جو بھی نئی بات سامنے آتی ہے، وہ اس سے گریز کر جاتے ہیں' (الشعراء ۵)

قول یعنی زبان کے ذریعے بیان کی گئی کسی حدیث کو سماعتوں کے ذریعے سنا جاتا ہے لیکن سننے والے کا قلب وذہن اگر دوسرے خیالوں میں مگن ہو تو کہی گئی بات یاداشت (Memory) تک نہیں پہنچتی کہ وہاں محفوظ ہو سکے اس لئے (یَفۡقَهُونَ) سمجھنے کی نوبت نہیں آتی۔

one sees and touches, they maintained, are imperfect copies of the pure forms studied in mathematics and philosophy. Accordingly, only the abstract reasoning of these disciplines yields genuine knowledge, whereas reliance on sense perception produces vague and inconsistent opinions. They concluded that philosophical contemplation of the unseen world of forms is the highest goal of human life. Aristotle followed Plato in regarding abstract knowledge as superior to any other, but disagreed with him as to the proper method of achieving it. Aristotle maintained that almost all knowledge is derived from experience. Knowledge is gained either directly, by abstracting the defining traits of a species, or indirectly, by deducing new facts from those already known, in accordance with the rules of logic.

The Stoic and Epicurean schools agreed with Aristotle that knowledge originates in sense perception, but against both Aristotle and Plato they maintained that philosophy is to be valued as a practical guide to life, rather than as an end in itself. (Microsoft ® Encarta ® Reference Library 2006).

جناب راغب کا یہ خیال حقیقت کے زیادہ قریب نہیں کہ فقہ علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں یعنی محسوسات کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کر کے ان کے ذریعے مجرد (Abstract Truths) کا سمجھنا۔ علم اپنے آپ میں ظاہر سے باطن کی جستجو کا نام ہے۔ علم شئے کے ظاہر سے اس کے باطن تک پہنچنے کا نام ہے۔ اور اشیاء کے مابین تعلق (Relationship) بھی اپنے آپ میں شئے کی حیثیت رکھتا ہے جو ظاہر ہے جسے آپ حساب (Mathematically) اور ''سائنسی فارمولوں'' کی صورت بھی بیان کر سکتے ہیں۔ قرآنِ مجید جناب راغب کے خیال کی تصدیق نہیں بلکہ نفی کرتا ہے۔

قَالُوا۟ يَـٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ

''انہوں نے کہا'' اے شعیب! تو جو کہتا ہے اس میں سے بہت کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا'' (حوالہ ھود۔۹۱)

انہیں کہی ہوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی اس لئے کہ سمجھنا چاہتے ہی نہیں تھے۔

وَإِن مِّن شَىْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِۦ وَلَـٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ (حوالہ الاسراء۔۴۴)

''اور (آسمانوں اور زمین میں) کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اگرچہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، نہ سمجھ سکو گے''

یہ جناب راغب کے اس خیال کہ فقہ علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں دوٹوک نفی ہے

أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡغَٰفِلُونَ o ’’یہ لوگ ہیں جو غافل ہیں‘‘

ٱلۡغَٰفِلُونَ مادہ ’’غ ف ل‘‘ کے بنیادی معنی ڈھانپ دینا، چھپا دینا، پردہ ڈال دینا ہیں۔ جن وانس میں سے ان لوگوں کو غافل، بے خبر، ڈھانپے ہوئے، پردہ پڑے ہوئے کس روش، رویئے کی بناء پر کہا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے بتایا

لَهُمۡ قُلُوبٌ لَّا يَفۡقَهُونَ بِهَا ’’ان کے دل ہیں مگر ان سے (يَفۡقَهُونَ) سمجھتے نہیں‘‘۔

وَلَهُمۡ أَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُونَ بِهَا ’’اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے بصارت نہیں لیتے

وَلَهُمۡ ءَاذَانٌ لَّا يَسۡمَعُونَ بِهَآ ’’اور ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں‘‘ (حوالہ الاعراف۔۱۷۹)۔ یہ غفلت دانستہ ہے

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ ٱسۡتَحَبُّواْ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا عَلَى ٱلۡأٓخِرَةِ وَأَنَّ ٱللَّهَ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡكَٰفِرِينَ ١٠٧

’’یہ اس لئے کہ انہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اس لئے کہ اللہ انکار کرنے والے لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ طَبَعَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ وَسَمۡعِهِمۡ وَأَبۡصَٰرِهِمۡۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡغَٰفِلُونَ ١٠٨

یہی ہیں وہ لوگ جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے، اور یہی غافل لوگ ہیں‘‘ (النحل۔۱۰۸)۔

ان آیات کے مطالعہ سے غیر مبہم انداز میں واضح ہے کہ يَفۡقَهُونَ کی منزل بصارتوں اور سماعتوں کی مرہونِ منت ہے۔ اور یوں اس لفظ کے معنی بات، علم کو سمجھنا ہیں۔ يَفۡقَهُونَ کا مادہ ’’ف ق ہ‘‘ ہے اور اس کے معنی کسی چیز کو جان لینا اور سمجھ لینا ہیں۔ جناب راغب نے کہا ہے کہ فقہ علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں یعنی محسوسات کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کر کے ان کے ذریعے مجرد (Abstract Truths) کا سمجھنا۔ قرآنِ مجید میں سے علم کے معنی اور مفہوم کو جان کر ابھی ہم پانچویں صدی قبل مسیح کے صوفسٹوں (Sophists) کے تخیل سے آزاد ہوئے ہی تھے کہ جناب راغب کا یہ خیال ہمیں سقراط، ارسطو، وغیرہ کے دور میں لے جاتا ہے

[In the 5th century bc, the Greek Sophists questioned the possibility of reliable and objective knowledge. Thus, a leading Sophist, Gorgias, argued that nothing really exists, that if anything did exist it could not be known, and that if knowledge were possible, it could not be communicated. Another prominent Sophist, Protagoras, maintained that no person's opinions can be said to be more correct than another's, because each is the sole judge of his or her own experience. Plato, following his illustr ious teacher Socrates, tried to answer the Sophists by postulating the existence of a world of u nchanging and invisible forms, or ideas, about which it is possible to have exact and certain knowledge. The things

وَنَطۡبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُونَ ٥

''اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگادیں جس کی وجہ سے پھر سن ہی نہ سکیں؟'' (حوالہ الاعراف۔۱۰۰)

وَطَبَعَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَعۡلَمُونَ ٥

اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔اس لئے اب وہ علم نہیں پاسکتے ، (حقیقت اور سچائی) جان نہیں سکتے'' (حوالہ التوبہ۔۹۳)۔

طَبَعَ مادہ ''ط ب ع'' کے متعلق ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کو کسی چیز کی انتہا کیلئے استعمال کرتے ہیں یعنی جہاں پہنچ کر وہ چیز ختم ہو جائے۔ پیمانے کے لبالب بھر جانے کو کہتے ہیں اور اس اعتبار سے مہر لگانے کو کہتے ہیں۔ مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ داخلے کے مقام پر غلاف چڑھا دینا کہ کوئی شئے اندر داخل نہ ہو سکے۔ بنی اسرائیل ہی کے متعلق فرمایا

وَقَوۡلِهِمۡ قُلُوبُنَا غُلۡفُۢ

''اور ان کے اپنے اس قول کہ ہمارے دلوں پر غلاف پڑے ہیں۔

بَلۡ طَبَعَ ٱللَّهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ٥

نہیں! درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب اللہ نے ان کے دلوں پر مہر (طَبَعَ) لگادی ہے

اور اس وجہ سے سوائے چند کے ایمان نہیں لاتے'' (حوالہ النساء۔۱۵۵)

انسان اگر اپنے قلب وذہن پر غلاف چڑھالے تو سماعت کے حقیقی معنوں میں سن نہیں سکتا اس لئے علم کو جان نہیں سکتا کیونکہ قلب وذہن ہی نے بات کو پرکھ کر یاداشت میں محفوظ کرنا اور اسے سمجھنا ہے۔ منافقین کے متعلق بتایا کہ جب جہاد کیلئے نکلنے کا حکم دیا جائے تو اس سے اجتناب، راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اور ان کی روش کا آخرکار نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قلب بھی حالت طَبَعَ پر پہنچ جاتے ہیں

رَضُواْ بِأَن يَكُونُواْ مَعَ ٱلۡخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُونَ ۝٨٧ (التوبہ۔۸۷)

''وہ اس پر خوش ہیں کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سمجھتے نہیں''

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ ءَامَنُواْ ثُمَّ كَفَرُواْ فَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُونَ ۝٣

''یہ اس لئے کہ وہ ایمان لائے، پھر انکار کر گئے سوان کے دلوں پر مہر لگ گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب سمجھتے نہیں'' (المنافقون۔۳)

قرآنِ مجید نے بتایا ہے کہ اگر قلوب پر غلاف چڑھالئے جائیں تو لَا يَسۡمَعُونَ۔ وہ سن نہیں سکتے، لَا يَعۡلَمُونَ۔ انہیں علم نہیں ہوسکتا، وہ نہیں جانتے، اور لَا يَفۡقَهُونَ۔ وہ سمجھ نہیں سکتے۔ کچھ لوگوں کے بارے میں کہا گیا

بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٤﴾

’’خوشخبری دینے والا اور خبر دار کرنے والا، مگر ان میں سے اکثر نے اس سے کنارہ کرلیا ہے، اس لئے وہ سنتے ہی نہیں‘‘

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ

اور کہتے ہیں ’’ہمارے دل اس سے جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے پردوں میں ہیں، اور ہمارے کان بند ہیں،

وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ ۝

اور ہمارے اور تیرے درمیان حجاب (آڑ، رکاوٹ) ہے، پس تو عمل کر، ہم بھی عمل کر رہے ہیں‘‘ (فصلت۔۴۔۵)

اور سورۃ فصلت ہی کی آیت ۴۴ کے آخر میں بتایا

وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ۝

’’مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور ان کیلئے یہ اندھا پن ہے (جیسے) انہیں کسی دور جگہ سے ندا دی جا رہی ہو‘‘

قرآنِ مجید بات کو الگ الگ کر کے بیان کرتا ہے اور پھیر کر بھی تا کہ سامع اور قاری کو ہر زاویے اور انداز سے بات سمجھ آجائے

انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝

’’دیکھ! ہم کس طرح پھیر پھیر کر آیتوں کو بیان کرتے ہیں تا کہ وہ (يَفْقَهُونَ) سمجھیں، کسی نتیجے پر پہنچیں‘‘ (حوالہ الانعام۔۶۵)

بات کو پھیر کر بیان کرنے سے اس کے معنی، مفہوم، وسعت، گہرائی، مختلف زاویے، منتہائیں اور مدعا و مقصد نکھر کر قاری کے سامنے آجاتا ہے جس سے بات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۝

’’ہم نے اپنی آیات کو الگ الگ کر کے بیان کر دیا ہے تا کہ لوگوں کو (يَفْقَهُونَ) سمجھ آئے‘‘ (حوالہ الانعام۔۹۸)

لیکن اگر قلوب پر أَكِنَّةً (غلاف، پردہ) پڑا ہو تو بات کو ’’يَفْقَهُوهُ‘‘ یعنی سمجھ نہیں سکتے۔ بات کی سمجھ اس وقت آسکتی ہے جب قلب و ذہن اسے پرکھ لے اور قلب و ذہن کی یاداشت میں محفوظ ہو جائے۔ انسان کے حوالے سے کان کے پردے پر آواز کی لہروں کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والے ارتعاش کا نام سماعت نہیں ہے۔ سماعتوں میں آنے والی بات، علم یاداشت میں اسی صورت میں محفوظ ہو گا اگر قلب و ذہن اسے پرکھ (interpret, process) لیں ورنہ سننا یا نہ سننا ایک جیسا ہے

وَجَعَلۡنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ أَكِنَّةً أَن يَفۡقَهُوهُ وَفِيٓ ءَاذَانِهِمۡ وَقۡرٗاۚ

مگر حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے قلوب پر غلاف ڈال دیئے ہیں جس کی وجہ سے وہ اسے سمجھ نہیں سکتے
اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے)''

ان کے ذہنی وفکری جمود اور ضد کی منتہا یہ ہے

وَإِن يَرَوۡاْ كُلَّ ءَايَةٖ لَّا يُؤۡمِنُواْ بِهَاۚ

''اور وہ خواہ تمام کی تمام نشانیاں (علم، معلومات) دیکھ لیں انہیں مانیں گے نہیں'' (حوالہ الانعام۔۲۵)

إِنَّا جَعَلۡنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ أَكِنَّةً أَن يَفۡقَهُوهُ وَفِيٓ ءَاذَانِهِمۡ وَقۡرٗاۖ

''ہم نے ان کے قلوب پر غلاف ڈال دیئے ہیں جس کی وجہ سے وہ اسے (قرآنِ مجید کو) سمجھ نہیں سکتے
اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے۔

وَإِن تَدۡعُهُمۡ إِلَى ٱلۡهُدَىٰ فَلَن يَهۡتَدُوٓاْ إِذًا أَبَدٗا ○

اور اگر آپ (ﷺ) انہیں ہدایت کی طرف بلائیں تو بھی وہ کبھی ہدایت پر نہ آئیں گے'' (الکہف۔۵۷)

أَكِنَّةً کا مادہ ''ک ن ن'' ہے اور اس کے معنی ہیں ہر چیز کا غلاف اور پردہ، چھپانا، ظاہر نہ کرنا، وہ جگہ جہاں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے، حفاظت سے رکھا ہوا، محفوظ۔ جس شئے نے سماعتوں اور بصارتوں کے ذریعے ملنے والی معلومات کو چھان پھٹک کر پرکھنا اور محفوظ کرنا تھا اگر اسی پر غلاف چڑھا لیا جائے تو پھر کسی بھی بات سے مستفید ہونے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ کمپیوٹر کے **Processor**، یعنی چھان پھٹک کرنے والے حصے پر غلاف چڑھا دیں تو وہ بھی ایک بیکار شئے بن جاتا ہے۔ قلوب پر غلاف چڑھانا انسان کا اپنا سوچا سمجھا فعل ہے

وَإِذَا قَرَأۡتَ ٱلۡقُرۡءَانَ جَعَلۡنَا بَيۡنَكَ وَبَيۡنَ ٱلَّذِينَ لَا يُؤۡمِنُونَ بِٱلۡأٓخِرَةِ حِجَابٗا مَّسۡتُورٗا ٤٥

''اور جب تو قرآن (مجید) پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت کو نہیں مانتے ایک حجاب مقرر کر دیتے ہیں۔

وَجَعَلۡنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ أَكِنَّةً أَن يَفۡقَهُوهُ وَفِيٓ ءَاذَانِهِمۡ وَقۡرٗاۚ وَإِذَا ذَكَرۡتَ
رَبَّكَ فِي ٱلۡقُرۡءَانِ وَحۡدَهُۥ وَلَّوۡاْ عَلَىٰٓ أَدۡبَٰرِهِمۡ نُفُورٗا ٤٦

اور ہم نے ان کے قلوب پر غلاف ڈال دیئے ہیں جس کی وجہ سے وہ اسے (قرآنِ مجید کو) سمجھ نہیں سکتے
اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے۔ اور اے (رسولِ کریم ﷺ) جب آپ قرآن (مجید) میں اپنے اکیلے رب کا ذکر کرتے ہیں
تو وہ پیٹھ پھیر کر بے رخی سے لوٹ جاتے ہیں'' (الاسراء۔۴۵۔۴۶)

''جولوگ اللہ اوراس کے رسول کودکھ دیتے ہیں اللہ نے ان پر دنیااورآخرت میں لعنت کی ہے اوران کیلئے رسوا کن عذاب تیار کررکھا ہے''

فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنے شہروں سے باہر کائنات کے دین کو سمجھنے کیلئے نکلنے کا کہا تھا یا اوامر اور نہی کے دین کو سمجھنے کیلئے؟

وَمَا كَانَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا۟ كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا۟ فِى ٱلدِّينِ وَلِيُنذِرُوا۟ قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوٓا۟ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾

''اور مومنین کیلئے ہرگز ممکن نہیں کہ تمام کے تمام نکل سکیں۔ اس لئے ایسا کیوں نہ کرلیا جائے کہ ہر جماعت میں سے کچھ افراد ایک طائفہ (گروپ، گروہ) بن کر نکلیں ''تاکہ ''الدین'' میں تفقہ کریں اور تاکہ اپنی قوم کو خبردار (مطلع) کریں جب وہ اپنی قوم میں واپس لوٹیں۔ اس طرح امکان ہے کہ قوم محتاط (**taking precautions**) ہوجائے، اور محتاط رہے''

اہل ایمان کو کائنات کا دین سیکھنے کی ترغیب دینے کا مقصد یہ نہیں بتایا کہ اس کے ذریعے انہیں دوسروں پر غلبہ پانے کا امکان پیدا ہوجائے گا بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں کے مادی علوم پر دسترس کے متعلق علم ہوجائے اور احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے مدافعت (**deterrence**) کی قوت پیدا کی جاسکے۔ ایمان لانے کا دعویٰ کرلینے کے بعد دنیاوی اسباب کی برتری ایسے لوگوں کیلئے غلبہ وقوت کا سند یشہ نہیں بن سکتی۔ اسباب دنیا کی برتری انہیں فائدہ اور غلبہ بھی ضرور دے گی جو ایمان لانے کا دعویٰ نہیں کرتے کیونکہ ان کا اسباب پر یقین کامل ہے۔ ایمان لانے کا دعویٰ کرلینے والا اگر اپنے اس اقرار کے بعد بھی دو کشتیوں میں سوار رہتا ہے تو پھر دونوں کی شفقت و اعانت سے محروم ہوجاتا ہے۔ اگر آج دنیا میں ہم برتر نہیں تو الزام ہم ہی پر ہے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ مشروط ہے

وَلَا تَهِنُوا۟ وَلَا تَحْزَنُوا۟ وَأَنتُمُ ٱلْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾